پاکستان اور امریکی دستور

نعیم صدیقی

(۳)

حکومت اور عوام کے درمیان توازن امریکی دستور میں دیکھنے کی ایک ہی چیز نہیں کہ اس میں کانگریس یا صدر یا ریاستی ایوانوں کو کتنے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ ان وسیع اختیارات کے بالمقابل اگر ترازو کے دوسرے پلڑے پر عوام کے حقوق کو رکھا جائے تب ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے کہ دستور نے کس حد تک توازن پیدا کیا ہے۔ اس سلسلے میں امریکی اور فرانسیسی دستور پر اظہار رائے کرتے ہوئے دستوریات کا ایک عالم جی۔ ایف اسٹرانگ کہتا ہے کہ یہ اولیں تحریری دستور ہیں جنہوں نے "آزادی اور اختیار یا انسانی حقوق اور قائم شدہ حکومت کو باہم دگر ہم آہنگ کرنے کا قریب ترین راستہ دریافت کر دکھایا۔"

حکومت کے پہلو سے دیکھیں تو وہ کامل حاکمیت کی امانت دار ہونے کے باوجود ہر ادارے اور ہر شعبے میں متعین اور محدود اختیارات (DEFINITE & LIMITED POWERS) رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صدارت کے منصب اور کانگریس اور ریاستوں کے ایوانوں کے لیے مدت کار (TENURE) مقرر ہے۔ دستور ایک فیصلہ کن طاقت کی حیثیت سے حکومت اور عوام کے درمیان پاسبان بن کر کھڑا ہے۔ عوام کے پہلو سے دیکھیں تو ان کے لیے وسیع حقوق متعین ہیں جن میں کوئی منصب یا ادارہ مداخلت نہیں کر سکتا۔

امریکی عوام کے دستوری حقوق کا مطالعہ کرتے چلیں تو ہمیں سب سے پہلے "اعلان آزادی" پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے جس کے الفاظ اور ان کے اندر کام کرنے والی روح یوں کے بتا دیتی ہے کہ حکومت کے مقابلے میں عوام کو کیا کچھ ملنا چاہیے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ تمام انسان مساویانہ[1] مرتبے کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں، کہ وہ اپنے خالق کی طرف سے بعض غیر منفک حقوق سے نوازے گئے ہیں، اور کہ ان حقوق کے تحفظ ہی کے تقاضے کے تحت انسانوں کے اندر حکومتیں قائم ہوتی ہیں جو اپنے جائز اختیارات رعایا کی رضامندی[2] سے حاصل کرتی ہیں، اور کہ جب کبھی حکومت کا کوئی نظام ان مقاصد کے لیے تباہ کن[3] ہو جائے، عوام کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے بدل دیں یا یکسر مٹا دیں اور اس کے بجائے ایک نئی حکومت پیدا کریں جو ایسی بنیادوں اور ایسے اصولوں پر استوار ہو اور اپنے اختیارات کو ایسی شکل میں مرتب کرے جو ان کی نگاہوں میں ان کے امن اور ان کی مسرت میں پسندیدہ ترین طریق سے حصہ لینے والی ہو"

بے جا نہ ہوگا، اگر ہم اس موقع پر فرانس کے انسانی اور شہری حقوق کے اعلامیہ کا خلاصہ بھی پیش کر دیں جو اسی جمہوری مزاج کا امانت دار ہے :۔

"انسان آزادی اور حقوق کے لحاظ سے مساویانہ حیثیت سے کر پیدا ہوئے ہیں ۱ـــ کسی بھی سیاسی نظام کا مقصود انسان کے ناقابلِ سقوط عملی حقوق کا تحفظ ہے۔ یہ ہیں آزادی، ملکیت، مامونیت اور زیادتی کا مقابلہ کرنے کے حقوق ۲ـــ آزادی عبارت ہے کسی بھی ایسی چیز کو عمل میں لانے کے اختیارات سے جو دوسروں کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے فطری حقوق کو استعمال کرنے میں آدمی پر صرف اتنی ہی تحدید عائد ہوتی ہے کہ معاشرے کے دوسرے افراد کو انہی فطری حقوق سے استفادہ کرنے کا پورا موقع حاصل رہے۔ ایسی تحدید قانون کے سوا اور کسی ذریعے سے عائد نہیں کی جا سکتی ۳ـــ قانون

[1] مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارے خداوندوں کی نگاہ میں پاکستان کی مائیں جن بچوں کو جنتی ہیں وہ نہ مساویانہ مرتبہ لے کے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ان کا خالق ان کو غیر منفک حقوق سے نوازتا ہے۔

[2] ہمارے ہاں کسی اختیار کے ہاتھ میں لینے اور استعمال کرنے میں رعایا کی رضامندی کا نہیں، صرف ایک حکمران گروہ کی رضامندی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

[3] یہاں اگر کوئی دستوری ہیئت عذابِ جان بھی بن گئی ہو تو بھی اسے بدلنے کے لیے عملی اقدام کا تو کیا، محض اس کے بارے میں پلیٹ فارم سے واویلا کرنے کا حق بھی دفعہ ۱۲۴ لگا کر سلب کر لیا جاتا ہے اور غداری کے الزامات الگ عائد کیے جاتے ہیں۔ وہ تھا ۱۷۸۹ء کا امریکہ، اور یہ ہے ۱۹۵۵ء کا پاکستان!

اجتماعی ارادے کا اظہار ہے"!

دونوں جگہ جوہری لحاظ سے ایک ہی نظریہ و تصور کام کر رہا ہے۔ انسان کا ایک خاص تخلیقی و فطری مرتبہ ہے جسے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور اس مرتبے سے ایک خاص نوع کے حقوق خود بخود سمجھ میں آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خلاصۂ مدعا یہ ہے کہ آدمی اینٹ پتھر یا گائے بھینس نہیں ہے، وہ انسان ہے اور اس کے ساتھ حکومت کی طاقت کو انسانوں کا سا معاملہ کرنا چاہیے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ تاریخ کے کئی لمبے ادوار میں انسان کو مسلسل اینٹ پتھر اور گائے بھینس بنا کے رکھا گیا ہے لیکن بالآخر انسان کے انسان ہونے کا شعور غالب آگیا اور اجتماعی ہیئتوں کو اپنا آپ بدل دینا پڑا۔

عوام کے حقوق | آئیے اب ہم عوام کے مسلّمہ حقوق کا جائزہ لیں جن کی گارنٹی امریکی دستور نے دی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

"کانگریس کوئی ایسا قانون بنانے کی مجاز نہ ہوگی جس کا مقصد کسی مذہب کو نافذ کرنا یا کسی مذہب پر آزادی سے عمل پیرا ہونے کو روکنا ہو[1] یا جس کے ذریعے تقریر یا پریس کی آزادی یا پُرامن طریق سے لوگوں کے اجتماع کرنے اور ازالۂ شکایات کے لیے حکومت سے مطالبہ کرنے کے حق کو گھٹانا ہو" (حقوق کی اضافی دفعہ ۱)

"ایک آزاد ریاست کی حفاظت کے لیے باقاعدہ منظم شدہ فوج کے ضروری ہونے کے باوجود عوام کے اسلحہ رکھنے اور اسے ساتھ لینے کے حق میں مداخلت نہیں کی جائیگی۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۲)

"کسی فوجی سپاہی کو کسی مکان میں اس کے مالک کی مرضی کے بغیر نہ تو زمانۂ امن میں، نہ زمانۂ جنگ ہی میں ٹھہرایا جائے گا، باستثناء اس صورت کے جو قانوناً مقرر کی گئی ہو" (حقوق کی اضافی دفعہ ۳)

"عوام کا یہ حق کبھی پامال نہ کیا جائیگا کہ ان کی ذوات، مکانات، کاغذات اور جائداد و املاک نامناسب تلاشیوں اور ضبطیوں کی دستبرد سے مامون رکھے جائیں۔ نیز وارنٹ نہ جاری کیے جائیں گے، مگر صرف کسی حتمی بنا کی موجودگی میں جس کے لیے حلف یا توثیق بہم پہنچائی گئی ہو، اور علی الخصوص اس جگہ کے تعین کے ساتھ جس کی تلاشی لی جانی ہو اور ان اشخاص یا اشیاء کی نامزدگی کے ساتھ جس کو تحویل میں لینا مطلوب ہو"

---

[1] یہ ایک سیکولر نظام حکومت کا فطری تقاضا ہے۔

(حقوق کی اضافی دفعہ ۴)

—— "کسی شخص کو قتل یا کسی دوسرے شرمناک جرم کی جواب دہی پر ہرگز مجبور نہ کیا جائے گا، مگر صرف مجلس قضائے عالی (GRAND JURY) کی پیشی میں اور باقاعدہ فردِ جرم عائد کیے جانے کی صورت میں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ معاملات ہوں گے جو جنگ یا کسی عوامی خطرے کی حالت میں بحری یا ہوائی فوج یا رضاکار دستوں میں رونما ہوں، درآنحالیکہ یہ دستے عملاً برسرِ کار ہوں۔ نیز کوئی شخص ایک ہی جرم کے تحت دو مرتبہ جانی یا عضوی نقصان کے خطرے میں ڈالے جانے کا سزاوار نہ ہو گا۔ نہ کسی فوجداری مقدمے میں اسے خود اپنے خلاف گواہی دینے پر مجبور کیا جائے گا، نہ اسے زندگی، آزادی یا جائداد سے بغیر ضروری قانونی کارروائی کے محروم کیا جائے گا، اور نہ ہی سرکاری استعمال کے لیے کوئی نجی جائداد بغیر منصفانہ معاوضہ ادا کیے حاصل کی جائے گی۔" (حقوق کی اضافی دفعہ ۵)

—— "تمام فوجداری مقدمات میں ملزم اس حق سے بہرہ ور ہو گا کہ اسی ریاست اور ضلع کی غیر جانبدار مجلسِ قضا کے سامنے اس کے خلاف مقدمہ کی تیز رفتار کھلی کھلی کارروائی عمل میں آئے جس کے حدود میں جرم کیا گیا ہو اور یہ ضلع پہلے سے قانون کی طرف سے متحقق ہو گا، نیز یہ کہ الزام کی نوعیت اور اس کے دلائل سے ملزم کو آگاہ کیا جائے گا، اور یہ کہ اسے مخالف گواہوں کے دوبدو لایا جائے گا، اور یہ کہ اپنی صفائی کے گواہوں کو وہ جبری طریقہ سے طلب کرا سکے گا، اور پھر یہ کہ اپنی مدافعت کے لیے وہ قانونی مشیر کی خدمات حاصل کر سکے گا۔" (حقوق کی اضافی دفعہ ۶)

—— "ریاست ہائے متحدہ کے خلاف بغاوت، صرف ان کے خلاف جنگ چھیڑنے یا ان کے دشمنوں سے وابستہ ہونے اور ان کو مدد اور سہولت بہم پہنچانے کی صورت میں منحصر ہو گی۔ کسی شخص پر بغاوت کی سزا اس کے صریح اقدام کے دو شاہدوں کے حلفیہ بیان یا کھلی عدالت میں اقرارِ جرم کے بغیر نافذ نہ کی جائے گی۔" (دفعہ ۳۔ شق ۳۔ ضمن ۱)

—— "قانونِ عام کے مقدمات میں جہاں متنازعہ فیہ مالیت بیس ڈالر سے زیادہ ہو، وہاں مجلسِ قضا کے سامنے مقدمہ سنے جانے کے حق کی پاسداری کی جائیگی، نیز مجلسِ قضا میں جس معاملے پر کارروائی کی جا چکی ہو،

قانونِ عام کے قواعد کی مطابقت سے ہٹ کر اس کی دوبارہ تحقیق ریاست ہائے متحدہ کی کسی دوسری عدالت میں نہ کی جائے گی"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۷)

— "بھاری ضمانتیں طلب نہ کی جائیں گی، نہ بھاری جرمانے عاید کیے جائیں گے، نہ ہی ظالمانہ اور غیر معمولی سزائیں ہی دی جائیں گی"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۸)

— "دستور میں بعض حقوق کے تعین کو، اُن دوسرے حقوق سے انکار کرنے یا ان کا وزن گھٹانے کے لیے وجہِ جواز نہ بنایا جائے گا جن سے عوام بہرہ مند ہیں"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۹)

— "ریاست ہائے متحدہ یا ان کے حدودِ اقتدار کے تحت کسی مقام پر نہ غلامی باقی رہے گی، نہ بیگار، الّا یہ کہ وہ کسی جرم کی سزا کے طور پر ہو، جبکہ متعلقہ فریق پر باضابطہ طریق سے جرم ثابت کیا گیا ہو"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۱۳)

— "کسی ریاست کی عدالتی طاقت ایسا کوئی قانون نہ بنائے گی، نہ نافذ کرے گی جو ریاست ہائے متحدہ کے شہریوں کے استحقاقات اور تحفظات کو کم کر دے، نہ وہ باضابطہ قانونی کارروائی کیے بغیر کسی شخص سے زندگی، آزادی یا جائداد سلب کرنے کی مجاز ہوگی، نہ ہی وہ اپنے حدودِ اختیار میں کسی شخص کو مساویانہ قانونی تحفظ سے محروم رکھے گی"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۱۴)

— "ریاستہائے متحدہ کے باشندوں کا حق رائے دہی نسل، رنگ یا سابق حالتِ غلامی کی بنا پر نہ توڑا جائیگا نہ اسمیں کمی کی جائیگی"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۱۵)

— "ریاستہائے متحدہ کے باشندوں کا حق رائے دہی صنفی امتیاز کی بنا پر نہ توڑا جائیگا، نہ گھٹایا جائیگا"۔ (حقوق کی اضافی دفعہ ۱۹)

— "ہیبیس کارپس کی صورت میں دادرسی کے حق کو معطل نہیں کیا جائے گا، بجز اس کے کہ بغاوت یا بیرونی حملہ کی صورتوں میں امنِ عامہ اس کا تقاضا کرے"۔ (دفعہ اشق ۹ ضمن ۲)

— "نہ تو شہری حقوق کو سلب کرنے کے لیے کوئی قانون (BILL OF ATTAINDER) منظور کیا جائے گا، نہ ہی موثر بہ ماضی (EX POST FACTO) قوانین پاس کیے جائیں گے"۔ (دفعہ اشق ۹ ضمن ۳)[1]

---

[1] حقوق کی یہ تفصیل SAUL K. PADOVER کی مختصر تازہ کتاب THE LIVING U.S. CONSTITUTION اور عام مطالعہ کے جملہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا اعلانیہ آزادی اور دستور سے ماخوذ ہے۔ واضح رہے کہ دستور کی انتہائی محتاط اور قانونی زبان کے لحاظ سے ایک مترجم کو جتنی کاوش کرنی چاہیے وہ نہیں کی جا سکی۔ تاہم اصل مدعا کو اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

حقوق کی اس فہرست کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ جس ملک میں ایک غیر تغیر پذیر تحریری دستور میں تمام انسانی حقوق ثبت کر دیئے گئے ہوں اور جن کی پاسداری کے لیے دستوری ضمانت دینے اور ایک مضبوط عدلیہ کو نگہبان بنا کر بٹھا دینے کے بعد حکومت کے بڑے سے بڑے منصب اور اعلیٰ سے اعلیٰ ادارے کو ان حقوق میں دست اندازی سے روک دیا گیا ہو اس میں آزادی اور اقتدار کے درمیان توازن کی نوعیت کیا ہوگی۔

یہ حقیقت معلوم عام ہے کہ یہ حقوق جو کاغذ پر بلا امتیاز ساری آبادی کو دیئے گئے ہیں، عملاً ان سے رنگین نسل بڑی حد تک محروم چلی آ رہی ہے، عالم واقعہ میں ان سے پوری طرح بہرہ مند صرف سفید فام نسل ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ ان حقوق آزادی کے اصل برگ و بار سرمایہ دار طبقے کے حصے میں جاتے ہیں اور یہ سارے حقوق محنت کش عنصر اور غریب عوام کو اس ظلم سے نہیں بچا سکتے جو نظام سرمایہ داری بہ حیثیت مجموعی ان پر قرنوں سے ڈھا رہا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ بنیادی نظریۂ ریاست کے منطقی تقاضے، عالمگیر رائے عامہ کی شرم اور کمیونسٹ حریف طاقتوں کی تنقید کے زیر اثر ان حقوق کو عام رکھا گیا ہے، لیکن سفید فام نسل جو اصل کارفرما طاقت ہے، عملاً ان کو عام کرنے کا ظرف نہیں رکھتی۔ تاہم تھوڑی دیر کے لیے امریکہ کی مظلوم و مقہور رنگین نسل کو دور کنار رکھ کر دیکھیں تو سفید فام نسل کی حد تک کسی کی مجال نہیں کہ ان حقوق کے کسی جز سے فرد کو محروم کر سکے۔

حقوق کی اس فہرست کو پیش کر کے ہم پوچھتے ہیں کہ ان میں سے کیا کیا کچھ آپ نے اپنے شہریوں کے لیے اب تک تسلیم کیا ہے؟ آپ امریکی صدر کے سے اختیارات ضرور لیجیے، لیکن عوام کو وہ حقوق بھی تو دیجیے جو اختیارات کو صحیح حدود میں رکھنے کا وسیلہ ہوں۔

عدلیہ کا پارٹ یوں تو صدر ہو یا کانگریس کے کسی ایوان کے ارکان، یہ لوگ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر ان کی نمائندگی کی ذمہ داری لینے کی وجہ سے سیاسی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دستور کے تقاضوں اور بنیادی حقوق کے محافظ بنیں، لیکن قانون سازی اور انتظام کے اعلیٰ اختیارات ہاتھ میں لینے کی وجہ سے انہی کی طرف سے یہ اندیشہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ان حقوق کو مجروح کریں۔ لہٰذا عوام اور حکومت کے

درمیان ایک تیسرے غیر جانبدار پاسبان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس ضرورت کو آزاد عدلیہ پورا کر سکتی ہے۔ یہ عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مقننہ کے فیصلوں اور انتظامیہ کے اقدامات کو دستور کی کسوٹی پر جانچے اور ان کے دستوری جواز و عدم جواز کا پورے اختیار کے ساتھ تصفیہ کرے۔

پس ناگزیر ہے کہ امریکی عدلیہ کی نوعیت اور اس کے دستوری مقام کو سمجھا جائے۔ سو دیکھنے کی اولین چیز یہ ہے کہ مقننہ کے مقابلے میں عدلیہ کی پوزیشن کیا ہے؟ اس پہلو سے دنیا کے عدالتی نظاموں کو دو قسموں میں رکھا جا سکتا ہے: ایک وہ عدلیہ جو مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین کو جوں کا توں نافذ کرنے والی ہو، جیسے برطانیہ میں! دوسری وہ عدلیہ جو خود مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین کے جواز و عدم جواز کا تصفیہ کرنے کی مجاز ہو اور جس کا کسی قانون کو خلافِ دستور قرار دے دینا اس پر خطِ نسخ کھینچ سکے۔ یہ دوسری قسم اپنے اختیار اور دائرۂ اثر کے لحاظ سے بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ امریکی عدلیہ — اس کی عدالتِ اعلیٰ — یہی مقام رکھتی ہے۔

دوسرا توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ کسی عدلیہ کو انتظامیہ کے بالمقابل کیا مقام حاصل ہے۔ اس پہلو میں پھر دو مسائل قابلِ غور ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ آیا عدالتی نظام فی الجملہ انتظامیہ کے ماتحت رکھا گیا ہے یا آزاد، یعنی تقرر و برخاستگی، ترقی و تنزل اور نگرانی و باز پرس کے اختیارات براہِ راست انتظامیہ کے ہاتھ میں ہیں یا عدلیہ اپنے داخلی نظم کی خود ہی مختار ہے؟ اس معاملے میں جدید ریاستیں عدلیہ کو انتظامیہ کے تصرف سے باہر نکال چکی ہیں اور مہذب کہلانے والی تمام دنیا میں "آزاد عدلیہ" ہی برسرِ عمل ہے۔ یاد رہے کہ اس معنی میں عدلیہ کے آزاد ہوئے بغیر عوام کے حقوق کا پورا تحفظ قطعی طور پر ناقابلِ تصور ہے[1]۔

اس پہلو سے متعلق دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیا عدلیہ کے سامنے حکومت کے کل پرزے اور عام شہری مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ جہاں عام شہریوں میں اور سرکاری عہدہ داروں اور ملازموں میں تفریق کی گئی ہے وہاں قانونِ عام کے بالمقابل ملازمین کے لیے جداگانہ انتظامی قانون (ADMINISTRATIVE LAW) مقرر

---

[1] ہمارے لیے یہ ایک قابلِ فخر حقیقت ہے کہ آزاد عدلیہ کو سب سے پہلے ہمارے محبوب نظامِ حیات — اسلام — نے عملاً برپا کر کے دکھایا۔ دنیا صدہا عقلی کاوشوں اور تلخ تجربوں سے گزر کر بہت بعد میں اس مقام تک پہنچی ہے۔

کیا گیا ہے اور عدلیہ کو اس انتظامی قانون کے تابع کام کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ انتظامی قانون کا مقصد حکومت کے کارندوں کو سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں کی جانے والی کارروائیوں کی حد تک قانونی تحفظ بہم پہنچانا ہے، حالانکہ اگر وہی کارروائیاں وہ عام شہری کی حیثیت سے کریں تو مجرم قرار پائیں اور مستوجب سزا ہوں۔ انتظامی قانون کے نفاذ کے لیے بالعموم جداگانہ انتظامی عدالتیں قائم کردی جاتی ہیں۔

اس عدالتی تفریق کے سسٹم کی ابتدا جدید دور میں فرانس نے کی، اور یورپ کے متعدد ممالک نے اس سسٹم کو اپنا لیا۔ اس سسٹم میں عدالتیں شہریوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کی جو آزادی رکھتی ہیں وہ ملازمین کے خلاف استغاثوں کی سماعت کے معاملہ میں ان کو حاصل نہیں ہوتی۔ ملازمین کے خلاف قانون کی متعینہ صورتوں میں سرکاری منظوری سے مقدمات لائے جا سکتے ہیں، بغیر اس کے کوئی عدالت مقدمہ نہیں لے سکتی۔ لیکن اس تحفظ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرکاری افسروں اور ملازموں کو قانون سے بالاتری یا چھوٹ حاصل ہے۔ وہ اگر سرکاری فرائض کی انجام دہی میں بھی قانون، ضابطے یا حکم کے خلاف اگر کوئی کارروائی کر بیٹھیں تو اس کے قانونی نتائج ان کو بہر حال بھگتنے پڑتے ہیں۔

بخلاف اس کے برطانوی دولت مشترکہ اور اس کی تابع نوآبادیات، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور لاطینی امریکی ریاستیں، ___ جو انیگلو سیکسن سسٹم آف لاء کے زیر اثر ہیں ___ اپنے عدالتی نظام میں شہریوں اور سرکاری افراد میں کسی تفریق کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اس یک آہنگ عدالتی نظام کو "قانون کی عملداری" RULE OF LAW کا اصطلاحی عنوان دیا گیا ہے۔ اس نظام کے تحت عدالتیں قانون کے تقاضے بلا امتیاز ہر شخص پر یکساں طور پر پورے کر سکتی ہیں۔

پروفیسر ڈائسی نے قانون کی عملداری کا مفہوم چند لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:-

"اس کا مطلب ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ ہمارا کوئی آدمی قانون سے بالاتر نہیں ہے، بلکہ (جو چیز کہ امتیازی ہے) یہ کہ ہر شخص، چاہے اس کا درجہ اور مرتبہ کچھ بھی ہو، سلطنت کے قانون عام کا پابند ہے اور معمولی مجالس قضا کے سامنے جوابدہ ہے"

یہاں یہ تذکرہ کردینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ قانون کی عملداری کا دور برطانیہ میں سنہ ۱۷۶۳ء سے شروع ہوتا ہے۔

یہ وہ موقع تھا جبکہ جارج سوم نے تاج کے خصوصی اختیارات کو غالب کر دینے کے لیے ایک آخری جدوجہد کی۔ ہُوا یہ کہ جان ولکس (JOHN WILKES) نے اپنے اخبار "شمالی برطانیہ" (THE NARTH BRITAIN) میں بادشاہ کی تقریر پر نکتہ چینی کر ڈالی۔ فوراً گرفتاری عمل میں آگئی (اہل پاکستان کو اس کا خوب اچھی طرح تجربہ حاصل ہے)۔ ایڈیٹر مذکور نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ہاؤس سیکرٹری کے اقدام کو چیلنج کر دیا۔ عدالت نے ہاؤس سیکرٹری کے خلاف ایک عام شہری کے حق میں ڈگری دے دی اور ایک ہزار پونڈ کا ہرجانہ مدعی علیہ پر ڈال دیا۔ اس موقع پر ہاؤس سیکرٹری کی پوزیشن کے عہدہ دار نے اپنے آپ کو قانون کے سامنے بالکل بے بس پایا، حالانکہ اس نے خالص سرکاری حیثیت میں ریاست کے مفاد کے نام پر ایک کارروائی انجام دی تھی۔ اس روز سے لے کر آج تک برطانوی عدلیہ کے سامنے سرکاری افراد اور عام شہری ایک ہی حیثیت میں پیش ہوتے اور جواب دہ ہوتے ہیں۔ پس جو عدلیہ قانون کی عملداری کے سسٹم پر کام کر رہا ہو وہ عوام کے شہری حقوق کا پوری طرح با اختیار اور آخری پاسبان ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی سسٹم امریکہ میں نافذ العمل ہے۔[1]

امریکی دستور کی دفعہ ۳ کی شق ۲ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ دستور نے عدلیہ کو کیا پوزیشن دی ہے۔ اس شق کی رُو سے عدالتی اختیار قانون و معدلت کے ان تمام معاملات پر حاوی ہے جو امریکی دستور یا ریاستہائے متحدہ کے قوانین یا طے شدہ اور آئندہ کے معاہدات سے پیدا ہوں ــــ تمام معاملات جو سفیروں، عوامی وزراء اور مشیروں پر اثر انداز ہوں ـــــ تمام معاملات جن کا تعلق بحری افسروں اور بحری حدود اختیار سے ہو ـــــ تمام نزاعات جن میں حکومتِ ریاست ہائے متحدہ ایک فریق ہو ــــ تمام نزاعات جو دو یا زائد ریاستوں کے درمیان یا ایک ریاست کے شہریوں کی طرف سے کسی دوسری ریاست کے خلاف پیدا ہوں، یا مختلف ریاستوں کے شہریوں کے درمیان واقع ہوں یا بیرونی ریاستوں سے متعلق نمودار ہوں۔

اس با اختیار ترین عدلیہ کی مظہرِ اعلیٰ سپریم کورٹ ہے۔ جو نو ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور ان میں ایک

---

[1] یہاں پھر یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس معاملے میں بھی ہمارا نظامِ حیات سب سے آگے رہا۔ دنیا میں پہلی مرتبہ اسی نے قانون کی عملداری کا سسٹم پیش کیا اور عملاً یہ نظیر قائم کی کہ وقت کا حاکمِ اعلیٰ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) اقلیتی عنصر کے ایک فرد کے بالمقابل عدالت میں طلب کیا جاتا ہے اور اسے بالکل مساویانہ حیثیت دی جاتی ہے اور پھر ڈگری بھی اس کے خلاف صادر کر دی جاتی ہے۔

چیف جسٹس ہوتا ہے۔ یہ سب سے اونچی مجلس قضا ہے جو ارکان کی کثرت رائے کے مطابق فیصلے دیتی ہے۔ یہ سارے جج صرف صحیح طرزِ عمل کی شرط کے ساتھ زندگی بھر کے لیے مامور کیے جاتے ہیں۔ اس لیے آزادانہ فیصلے دینے میں کوئی چیز ان کے سامنے حائل نہیں ہو سکتی۔ اس عدالت کا کام یہ ہے کہ کسی قانون کا دستور کی دفعات کے مطابق یا مخالف ہونا واضح کرے۔ اب تک کے دور میں ۷۳ مواقع ایسے آئے ہیں جبکہ عدالت نے زیر بحث قوانین کو کلی یا جزوی طور پر دستور کے خلاف قرار دیا ہے۔

چند مثالیں: "قانون کی عملداری" کے اصول پر کام کرنے والے اس عدلیہ نے اب تک جو پارٹ عوام کے دستوری حقوق کے تحفظ میں ادا کیا ہے اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم چند مثالیں بھی پیش کر دیں۔

۱۔ ۱۷۹۳ء میں سپریم کورٹ نے دستور کی تعبیر و توضیح کرتے ہوئے ایک شہری کا یہ حق تسلیم کیا کہ وہ کسی ریاست کے خلاف دعویٰ کر سکتا ہے[1] اس فیصلے میں استدلال کرتے ہوئے جج نے لکھا کہ:

"میں خندہ پیشانی سے اعتراف کرتا ہوں کہ ریاست انسان کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس دنیا کو سامنے رکھتے ہوئے خود انسان ——— آزاد اور دیانتدار انسان ——— خدا کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے۔"

۲۔ ۱۸۰۳ء میں قصہ یوں ہوا کہ جان آدم نے صدارت سے علیحدگی کے موقع پر ولیم ماربوری کو قضا کے عہدے پر مقرر کیا۔ نئے صدر تھامس جیفرسن نے اپنے سیکرٹری آف اسٹیٹ میڈیسن کو حکم دیا کہ وہ ماربوری کو کمیشن نہ دے۔ ماربوری نے دعویٰ دائر کیا کہ اسے میڈیسن سے کمیشن دلوایا جائے۔ اس میں چونکہ عدالتی فرمان جاری کرنے کی بھی درخواست کی گئی تھی اس لیے خود وہ قانون بھی زیر بحث آ گیا جس کے تحت فرمان کا اجرا واجب آتا تھا۔ کانگرس کے پاس کردہ اس قانون کو پہلی مرتبہ سپریم کورٹ نے ناروا قرار دے کر آئندہ کے لیے نظیر قائم کر دی۔ دوسری طرف اس نے قانونی رائے یہ دی کہ میڈیسن کو کمیشن روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس جرأت مندانہ فیصلے میں کورٹ کے مرتبہ کو جس استدلال سے معین کیا گیا ہے اس کی چند کڑیاں ملاحظہ ہوں:-

[1] اس فیصلے کے خلاف اس قدر احتجاج ہوا کہ دستور میں گیارہویں ترمیم کے ذریعے اس کا سدباب کر دیا گیا۔

"مقننہ کے اختیارات متعین اور محدود ہیں اور ان حد بندیوں کو نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے، نہ ان کے معاملے میں سہو سے کام لیا جا سکتا ہے، کیونکہ دستور تحریری ہے۔ اگر ان حدود کو ان طاقتوں کی طرف سے توڑا جانے لگے جن کو اس سے باز رکھنا مطلوب ہے تو پھر کیا مقصد ہے ان تحدیدات کا اور کیا غایت ہے ان کو حیطۂ تحریر میں لانے کی! —— اس مسئلہ میں بحث بالکل سادہ ہے کہ یا تو دستور ہر اس قانون پر قابو رکھتا ہے جو اس کے خلاف پڑے، یا پھر مقننہ معمولی قانون کے ذریعے دستور کو بدل سکتی ہے —— اگر پہلا جزو درست ہو تو دستور کے خلاف پڑنے والا کوئی ایکٹ قانون نہیں ہو سکتا، اگر دوسرا جزو درست ہو تو پھر تحریری دساتیر ایک فضول کاوش ہیں —— اب اگر مقننہ کا بنایا ہوا، دستور کے خلاف پڑنے والا کوئی قانون باطل ہے تو کیا قطع نظر اس کے بطلان کے، وہ عدالتوں کو اس امر کا پابند بنا دیتا ہے اور ان پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے کہ وہ اسے نافذ کریں؟ یا بالفاظ دیگر قانون کی حیثیت نہ رکھتے ہوئے بھی کیا وہ ایک قابلِ نفاذ ضابطہ قرار پا سکتا ہے، جیسا کہ اس کے قانون ہونے کی صورت میں ہوتا۔ یہ تو اس تعمیر کو اکھیڑ پھینکتا ہے جو اصولاً برپا کی گئی ہے۔ شعبۂ عدلیہ کا یہ اختیار اور فرض ہے کہ وہ بتائے کہ قانون کیا ہے! اگر دو قوانین باہم دگر متصادم ہوں تو عدالتوں کو دونوں کے عمل کے بارے میں فیصلہ دینا چاہیے۔ پس اگر کوئی قانون دستور کے بالمقابل آتا ہے اور اگر دستور اور قانون دونوں ایک خاص معاملے میں لاگو ہوتے ہیں تو عدالت کو یا تو دستور سے آنکھیں بند کرکے قانون کے مطابق اس پر فیصلہ دینا چاہیے یا قانون کو نظر انداز کرکے دستور کے مطابق اس کا فیصلہ کرنا چاہیے، عدالت کو یہ تعین کرنا پڑے گا کہ دونوں متصادم ضابطوں میں کونسا ہے جو پیش نظر معاملے پر مؤثر ہوگا۔ فریضۂ انصاف کی یہی اصل روح ہے۔ —— آخر کیوں ایک جج ریاست ہائے متحدہ کے دستور کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی کا حلف لیتا ہے، اگر دستور اس کی حکومت کے لیے کوئی ضابطہ نہیں پہنچاتا، اور اگر دستور اس کے لیے بند کر دیا گیا ہے اور وہ اس کا جائزہ نہیں لے سکتا! اگر صورت واقعہ یہی ہو تو یہ فریب محض سے بدتر ہے! ایسے حلف کو لازم ٹھیرایا جانا اور اس کا اٹھانا یکساں جرم ہیں!"

۴ - ۵ / اکتوبر ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے کہ پریذیڈنٹ لنکن نے کانگریس سے اختیار حاصل کرکے ان لوگوں کے

لیے ہیبیس کارپس کے حق کو معطل کر دیا جو فوجی جرائم میں پکڑے جائیں۔ اس حالت میں فوج نے ایک شخص (MILLIGAN) کو گرفتار کیا اور فوجی عدالت کے تحت اسے سزائے موت سنادی۔ اس شہری نے ہیبیس کارپس کی صورت میں عدالت کے سامنے اپیل دائر کیا۔ عدالت نے فوجی فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ ملزم کا معاملہ سول عدالت کے سامنے جانا چاہیے تھا۔ اس فیصلے کے بھی چند فقرے ملاحظہ فرمائیے:-

"اس عدالت کے سامنے اس سے زیادہ سنگین اور اس سے بڑھ کر باشندگانِ ملک کے حقوق سے قریبی تعلق رکھنے والا معاملہ کبھی پیش نہیں ہوا کیونکہ ہر امریکی شہری کا یہ پیدائشی حق ہے کہ جب اس پر کوئی الزام لگایا جائے تو اس پر قانون کے مطابق مقدمہ چلایا جائے اور سزا دی جائے۔ سزا دہی کا اختیار صرف ان صورتوں میں ہے جن کو اس مقصد کے لیے قانون بہم پہنچاتا ہے اور اگر وہ صورتیں غیر موثر ہوں تو پھر سزا سے برأت ہے ۔۔۔ پھر کوئی سوال نہیں اس بات کا کہ کوئی فرد کتنا بڑا مجرم ہے یا اس کے جرم نے ملک کے جذبۂ انصاف کو کتنا دھکا لگایا ہے یا اس کے امن و امان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ قانونی تحفظ کے ذریعے انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، اس ضمانت کو ہٹا لو تو پھر لوگ بد اطوار حکمرانوں اور مشتعل عوام کے ہنگاموں کے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر اس فوجی مقدمہ کو جائز قرار دینے کے لیے کوئی قانون موجود ہے تو پھر اس میں دخل دینا ہمارا کام نہیں ہے، نہیں تو پھر تمام کارروائی کے بطلان کا فیصلہ دینا ہمارا فرض ہے۔ اس سوال کے فیصلے کا دار و مدار دلائل اور عدالتی نظائر پر نہیں ہے جو کثیر التعداد بھی ہیں اور بڑی خوبی سے مشرح بھی! یہ نظائر تو بس ہمیں آزادی کو بچانے اور سول آبادی کو فوجی مقدمات سے بچانے کی جدوجہد کی وسعت سے آگاہ کرتے ہیں۔"

ریاست ہائے متحدہ کا دستور حکمرانوں اور عوام کے لیے قانون ہے۔ جیسا زمانۂ امن میں ویسا ہی زمانۂ جنگ میں! اور یہ انسانوں کے تمام طبقات کے لیے سارے زمانوں میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے تحفظ کی ڈھال فراہم کرتا ہے۔ انسانی ذہانت اس سے زیادہ تباہ کن نتائج رکھنے والے کسی نظریہ کا انکشاف نہیں کر سکی کہ حکومت کے کسی شدید مشکل دور میں اس دستور کی کوئی دفعہ معطل کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کا نظریہ سیدھا بدنظمی اور استبداد کے راستے پر لے جاتا ہے۔ رہا ضرورت کا فلسفہ جس پر یہ

مبنی ہے، سرے سے ہی باطل، کیونکہ دستور کے اندر رہتے ہوئے حکومت کو تمام وہ اختیارات حاصل ہیں جو اس کے وجود کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔

ہر مقدمہ میں عدالتی اختیار کا استعمال ہونا ضروری ہے، تو پھر فوجی کمیشن جس نے کہ اس (ملزم) پر مقدمہ چلایا ہے، کہاں سے یہ اختیار اخذ کرتا ہے جو یقیناً عدالتی اختیار کا کوئی حصہ ان کو سونپا نہیں گیا . . . . یہ ادعا نہیں کیا گیا کہ فوجی کمیشن کانگریس کی طرف سے مامور کردہ اور قائم کردہ عدالت تھا یہ لوگ صدر کے اذن کو وجہ جواز نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ تو قانون کا پابند ہے اور وہ اپنے فرض کے لیے ایک مناسب دائرۂ کار رکھتا ہے، اس کا کام قانون کی تنفیذ ہے نہ کہ قانون بنانا۔ اور کوئی تحریری ضابطۂ تعزیرات ایسا موجود نہیں ہے جس کے ماخذ اختیار ہونے کا حوالہ دیا جا سکے۔

پس ایک واضح دستوری دفعہ کو پامال کیا گیا ہے جبکہ ملیگان پر ایک ایسی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا ہے جسے کانگریس نے مامور اور قائم نہیں کیا ــــ آزادی کی ایک اور ضمانت توڑ دی گئی ہے جبکہ ملیگان پر مجلس منصفان (جیوری) کے سامنے مقدمہ چلانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ یہ حق جو ایک آزاد ملک میں انتہائی قیمتی ہوتا ہے ہر اس شخص کے لیے محفوظ ہے جس پر کسی جرم کا الزام لگایا جائے اور جو فوج، بحریہ یا عملاً برسرِ کار ہونے والے رضاکار دستوں میں شامل نہ ہو۔

صورتِ مفروضہ یہ ہے کہ زمانۂ جنگ میں مسلح فوج کا کوئی کمانڈر (جب اس کی نگاہ میں ملک کے شدید حالات اس کا تقاضا کریں اور اس معاملے میں جج خود وہی ہے) اس کا مجاز ہے کہ اپنے فوجی علاقے میں شہری حقوق اور ان کے متعلق دادرسی کی صورتوں کو معطل کر دے اور شہریوں کو بالکل سپاہیوں کی طرح اپنی مرضی کی حکومت میں لے لے، اور اسے اس قانونی اختیار کے استعمال سے بجز اس کے افسر برتر یا ریاست ہائے متحدہ کے صدر کے اور کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔

مارشل لاء اگر اس بنیاد پر لگایا جائے تو وہ دستور کی ہر ضمانت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اور نہایت مؤثر طریقے سے فوج کو شہری حکومت کے اختیارات سے آزاد اور بالاتر بنا دیتا ہے۔ شہری آزادی اور مارشل لاء کی یہ صورت دونوں بیک وقت نبھ نہیں سکتے۔ تضاد لاینحل ہے اور دوران کشمکش میں دونوں

میں سے ایک چیز کو ختم ہو جانا ہو گا۔

قوم ــــ جیسا کہ تجربات نے ثابت کیا ہے ــــ ہمیشہ حالتِ امن میں نہیں رہ سکتی اور وہ یہ امیدیں باندھنے کے لیے کوئی اساس نہیں رکھتی کہ ہمیشہ اسے دانش مند اور انسانیت نواز حکمران ملتے رہیں گے جو ایمانداری سے دستور کے اصولیات سے وابستہ رہیں۔ بد اطوار لوگ ــــ قوت کے حریص، آزادی کی تحقیر اور قانون کی توہین کر کے اس خالی جگہ کو پُر کر سکتے ہیں جس پر کبھی واشنگٹن اور لنکن فائز ہوتے۔ اس مسلم کی پیچیدگی کے لیے اگر ہمارے آباؤ اجداد کوئی چارۂ کار فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں تو پھر وہ اس امانت کو ادا کرنے میں کھوٹے نکلے جس کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی۔

ان دستوری تحفظات میں سے کسی میں بھی صدر یا کانگریس یا عدلیہ گڑبڑ نہیں کر سکتی، سوائے ایک ہیبیس کارپس کے حق دادرسی کے!

لیکن اس پر زور دیا جاتا ہے کہ زمانۂ جنگ کی حد تک ملک کی حفاظت تقاضا کرتی ہے کہ مارشل لا کے لیے اتنے وسیع ادعا کو تسلیم کیا جائے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک جس کا تحفظ آزادی کے تمام بنیادی اصولوں کی قربانی دے کر کیا جا سکتا ہو سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ اس کا بچاؤ کیا جائے"۔

پڑھیے ان الفاظ کو، اور پھر یاد کیجیے جو مارشل لا ۱۹۵۳ء میں لاہور پر لگایا گیا تھا اور جو جو کارروائیاں فوجی اقتدار میں کی گئی تھیں۔ اور پھر دیکھیے کہ کس طرح بات بات پر بعض لیڈران کرام اہلِ پاکستان کو مارشل لا کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ کیا نسبت ہے اس ذہنیت کو امریکی دستور کے مقاصد اور اس کی اسپرٹ سے!

۴۔ اسی سلسلے میں تازہ ترین فیصلہ وہ ہے جو ۱۹۴۶ء میں دیا گیا تھا۔ پرل ہاربر کے حادثہ کے بعد فوج نے ہوائی میں فوجی عدالت قائم کی۔ فوجی اور سول حکام کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ معاملہ عدالت کے سامنے لایا گیا اور عدالت نے دستور کا تقاضا واضح کرتے ہوئے فوجی عدالت اور فوجی مقدمات کو ناجائز قرار دیا۔ اس فیصلہ کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:۔

"بہت سے ملکوں اور زمانوں کے لوگ انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ پر مکمل فوجی حکومت کے تسلط کے

خلاف خطرہ محسوس کرتے رہے ہیں اور بے دھڑک اس کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ جس کے بارے میں حکومت کا ادعا یہ ہے کہ کانگریس نے یہاں اسے روا ٹھہرا دیا ہے۔

عدالتیں اور ان کے طریق کار روائی میں شامل تحفظات ہمارے نظام حکومت کے لیے بالکل ناگزیر ہیں۔ یہ آزادیوں کی حفاظت کے لیے ہمارے موسسین کے ہاتھوں قائم کیے گئے تھے اور ان آزادیوں کو وہ قیمتی محسوس کرتے تھے ـــــ وہ ایسی حکومتوں کے مخالف تھے جنہوں نے قانون کو بنانے، اس کی تعبیر کرنے اور اسے نافذ کرنے کے اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں دیے۔ ان کا فلسفہ ہماری ساری تاریخ کے دوران میں عوام کا فلسفہ تھا۔ اسی سبب سے ہم نے شہریوں یا ان کے نمائندوں کے ذریعے چنی ہوئی مجالس قانون ساز کو وجود دیا ہے اور مقننہ کے منظور کردہ قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں پر مقدمات چلانے کے لیے عدالتیں اور مجالس قضا قائم کی ہیں۔ ہم فوجداری مقدمات کی سرسری سماعت کے امکانی مفاسد کے متعلق خاص طور پر ہمیشہ متوجہ رہے ہیں اور ہم نے خود دستور میں شامل شدہ دفعات کے ذریعے ان کے خلاف برابر پاسبانی کی ہے۔

فوج جس ملک سے تعلق رکھتی ہو اس کو ہمیشہ اس ملک کے قوانین کے تابع رکھا جانا چاہیے اور جو کوئی اس کے برعکس ادعا کرتا ہے وہ نظام جمہوریت کا خیر خواہ نہیں ہے۔"

۵۔ ۱۹۳۴ء میں لوزیانا کی حکومت نے ۲۰ ہزار سے زیادہ کی اشاعت رکھنے والے اخبارات پر لیک ٹیکس لگایا اور ۹ اخبارات کی طرف سے اس اقدام کو عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ عدالت نے فیصلہ حکومت کے خلاف دیا۔ ۱۹۳۵ء کے اس فیصلے کے چند الفاظ ہم پیش کرتے ہیں:۔

"پہلا نکتہ انتہائی سنجیدگی و اہمیت رکھنے والا سوال سامنے لاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ اقدام کامیاب رہے تو یہ ایک منظم سوسائٹی کے ارکان ـــــ جو مشترک فلاح و بہبود کے لیے متحد ہوئے ہیں ـــــ کے اس فطری حق کی جڑوں پر ضرب لگاتا ہے کہ وہ اپنے مشترک مفاد کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں اور حاصل کریں۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے مطلوب یہ تصور دلانا نہیں ہے کہ گورنمنٹ کو قوت بہم پہنچانے

والے ٹیکسوں کی معمولی صورتوں میں سے کسی سے بھی مالکان اخبارات بالاتر ہیں لیکن یہ ٹیکس کی ایک معمولی صورت نہیں ہے۔ بلکہ اپنی مثال آپ ہے اور اپنے ساتھ پریس کی آزادی کے خلاف دشمنانہ بدسلوکی کی ایک لمبی تاریخ لیے ہوئے ہے ـــــ یہ ٹیکس کے لباس میں اس امر کی سوچی سمجھی ہوئی ایک چال دکھائی دیتی ہے کہ اس کے ذریعے خبریات و معلومات کی توسیع کا دائرہ محدود کیا جائے حالانکہ عوام دستوری ضمانتوں کی بدولت اس کے حقدار ہیں۔"

محض ان چند مثالوں سے پورا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ عدلیہ کا پارٹ کن سرحدوں تک پہنچتا ہے۔ نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ صدر اور حکمران چیخ پڑتے ہیں خصوصاً امریکہ کے مضبوط حیثیت کے پریذیڈنٹوں نے اس امر کی کوشش کی کہ مرکز کے دائرہ اقتدار کو وسیع تر کیا جائے۔ اس تبدیلی کو "NEW DEAL" کا نام دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں سپریم کورٹ نے اس سلسلے کے اکثر اقدامات کے بارے میں فیصلہ دیا کہ یہ غیر دستوری ہیں۔ اسی طرح نئی زراعتی تنظیم کو ملک گیر پیمانے پر روبعمل لانے کے لیے ۱۹۳۶ء میں صدارت کی طرف سے پھر اقدام کیا گیا۔ سپریم کورٹ نے یہ رائے دی کہ اس اسکیم سے ریاستوں کے دستوری حقوق کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے بعد NATIONAL INDUSTRIAL RECOVERY ACT کو بھی خلاف دستور قرار دے دیا گیا۔ اس پر فروری ۱۹۳۷ء میں صدر نے کانگریس کو تنگ آکر یہ پیغام بھیجا کہ فیڈرل عدلیہ کو نئے نقشے پر مرتب کیا جائے۔ اس پیغام کا ایک جملہ ملاحظہ ہو:۔

"کوئی وزن اس بات کا نہیں کہ ایک قانون کو کانگریس نے پاس کیا ہے، نہ اس بات کا کہ انتظامیہ نے اس کی منظوری دی ہے اور اس بات کا کہ انتظامی مشینری اسے عمل میں لانے کی منتظر کھڑی ہے ـــ عدلیہ ایک زائد منصب حاصل کرتی جارہی ہے اور وہ قومی مقننہ کا تیسرا ایوان بننے کے درپے ہے جو منتشر، ڈھیلے طور پر منظم اور سست رفتاری سے کام کرنے والا ہے۔"

حد یہ تھی کہ عدلیہ نے مقننہ اور حکومت کے بعض اقدامات کو فاشزم اور ڈکٹیٹر شپ کا عنوان دیا لیکن عدلیہ کی ترتیب بدلنے کی اسکیم سینیٹ کے سامنے آکر مفقود ہوگئی۔

(باقی)